بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

زوال اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑا ہمہ گیر اور کلیت پسند واقع ہوا ہے۔ یہ جب کسی قوم پر آتا ہے تو اس کی پوری زندگی تہ و بالا کر دیتا ہے۔ اُس کی حیات کا کوئی گوشہ اور اُس کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ پھر ایسا نہیں رہتا جس پر اس کی منحوس پرچھائیں نہ پڑتی ہوں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس زوال کی پہلی زد ہمیشہ کسی قوم کے سوچنے کے انداز اور غور و فکر کے طور طریقوں پر پڑتی ہے۔ سب سے پہلے فکر و نظر اور احساس و وجدان کی چولیں ہی ہلتی ہیں بعد اس کے بعد اس قوم کی معاشرت، سیاست اور معیشت میں، جو دراصل اس کے قلب و نگاہ کے ہی خارجی مظاہر ہیں، ایک زبردست بگاڑ رونما ہونا شروع ہوتا ہے۔

قدرت کے اس ضابطے کا اگرچہ انسانوں کا ہر گروہ کسی حد تک پابند ہے مگر وہ قوم اس کی زیادہ تابع ہے جو انسان کے افکار و نظریات کو مادی ماحول کا عکس نہیں سمجھتی۔ بلکہ اجتماعی ماحول کو انسانوں کی داخلی کیفیات کا شارح اور ترجمان خیال کرتی ہے۔ اس قوم کے نزدیک فکر و نظر کی تبدیلی موت کے مترادف ہے خواہ اُس کی خارجی زندگی میں اس کے اثرات کچھ بہت نمایاں نہ ہوں۔

پھر امتِ مُسلمہ کا معاملہ تو اس لحاظ سے اور بھی نازک ہے۔ اس امت کو بلاشبہ کہا تو یہی گیا ہے کہ تم اس کارگہِ حیات میں ایک غیر متعلق تماشائی بن کر نہ رہو بلکہ اجتماعی زندگی کے عین منجدھار میں رہتے ہوئے حق اور صداقت کی گواہی دو لیکن اس کے لیے اصل اور

حقیقی زندگی صرف آخرت ہی قرار دی گئی ہے۔ دنیا کی اس امتحان گاہ میں جو اچھے افعال و اعمال اس سے سرزد ہوتے ہیں وہ اس کی فلاح و کامرانی کا ذریعہ تو بن سکتے ہیں مگر وہ بجائے خود فلاح و کامرانی نہیں کہلائے جا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی کامیابی کا مدار ظاہری اعمال پر نہیں بلکہ اُس نیت پر ہے جو ان کے پس پردہ کام کرتی ہے اور چونکہ نیت ایک ایسی لطیف اور غیر مرئی شے ہے جسے نہ تو کوئی ترازو خواہ وہ کتنا ہی حساس ہو، تول سکتا ہے، نہ کوئی خوردبین خواہ کتنی ہی طاقتور ہو، دیکھ سکتی ہے، نہ کوئی پیمانہ خواہ کتنا ہی صحیح ہو، اس کی پیمائش کر سکتا ہے۔ اس لیے دنیا کی کوئی عدالت خواہ وہ کتنی ہی بے لاگ کیوں نہ ہو، نیت پر کوئی حکم نہیں لگا سکتی۔ اس کی جزا تو وہی علیم و خبیر ذات دے سکتی ہے جس کی نگاہ سے کوئی کھلی اور چھپی چیز اوجھل نہیں رہ سکتی۔ جس کی نظر بیک وقت ظاہری اعمال اور قلبی واردات پر پڑتی ہے۔ لہٰذا ایک مسلم کے لیے کامیابی کا معیار سلطنت کی توسیع، سڑکوں اور ہسپتالوں کی تعمیر، زر و مال کی فراوانی نہیں بلکہ اُس دن کی سرخروئی ہے جس کا نقشہ قرآنِ حکیم نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں کھینچا ہے:

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝	جب زمین اپنی سخت جنبش سے خوب ہی ہلا ڈالی
وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ	جائے گی اور زمین اپنے بوجھ باہر پھینک نکالے گی
الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ	اور آدمی بول اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ اُس
أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ	دن زمین اپنی سب خبریں بیان کر گزرے گی، اس
يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝	لیے کہ پروردگار کا حکم اسے یہی ہوگا۔ اس دن
فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝	لوگ جدا جدا نکلیں گے تاکہ ان کے اعمال انہیں
وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝	دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی
(سورۂ زلزال)	ہوگی وہ اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر
	بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھے گا۔

مندرجۂ بالا سطور میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اُس کا کہیں یہ مطلب نہ سمجھ لیا جائے کہ ہمارے نزدیک دنیا اور اس کے مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ نہیں ہماری اس گزارش کا یہ مدعا ہرگز نہیں۔ سلطنت کا استحکام اور اس کا بہتر سے بہتر انتظام و انصرام، شفاخانوں اور درس گاہوں کا قیام اپنی جگہ نہایت ضروری چیزیں ہیں اور اس راہ میں جدوجہد ایک مسلمان کے لیے ذریعۂ نجات بھی بن سکتی ہے۔ مگر ہم اس سلسلہ میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ یہ سب کوششیں ایک مسلمان کے لیے صرف اسی صورت میں مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں جب ان کے پیچھے صرف خدا کی رضا جوئی کا جذبہ کارفرما ہو۔ اور اگر نیت کا سرچشمہ گدلا ہو گیا تو یہ سب کارنامے چاہے دنیاوی اعتبار سے کتنے ہی مہتم بالشان ہوں مگر ایک مسلم کے لیے بالکل عبث اور بیکار بلکہ ضرر رساں ہیں۔ کیونکہ یہ سب عدل کی اس میزان میں بالکل بے وزن ثابت ہوں گے جو حشر کے دن لوگوں کے اعمال تولنے کے لیے نصب کی جائیگی۔ وہاں تو انسان کی وہی کارگزاریاں وزنی ثابت ہونگی جن کی بنیاد اخلاص پر ہو، جو شخصی سود و زیاں یا اجتماعی مصالح پر مبنی نہ ہوں بلکہ صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کی جائیں۔ ایک مومن کا مطلوب و مقصود سوائے خدا کی خوشنودی کے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور اس کا حصول ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ ایک اپنی سعی و جہد کو خدا کی رضا جوئی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور دوسرا اُسے مادی ترقی کے معیار پر جانچنے کی کوشش کرتا ہے ایک خدا ناشناس انسان کی نظر میں کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے لیے، یا اگر وہ ذرا ایثار پیشہ ہے تو اپنی قوم اور اپنے وطن کے لیے مادی خوشحالی کا زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کرے۔ یہی چیز اُس کے لیے اقدارِ حیات یا "خوب و ناخوب" کے پیمانے متعین کرتی ہے۔ وہ دنیا میں جو کچھ سوچتا ہے، یا جو کچھ کرتا ہے اُس کا منتہائے مقصود مادی طاقت اور قوت کا حصول ہے

یا دوسرے لفظوں میں یہی اُس کا "عُقبیٰ" و "آخرت" ہے۔ اس کے برعکس ایک خدا پر ایمان رکھنے والا انسان اگرچہ اپنی "عمرِ گریزاں" اسی مادی دنیا میں بسر کرتا ہے اور اس کے ذرائع و وسائل سے متمتع بھی ہوتا ہے لیکن وہ اپنے افکار و اعمال کا محرک مادی طاقت اور قوت کی فراہمی کو نہیں بناتا بلکہ زندگی کے ہر کام میں اپنے مالک کی رضا تلاش کرتا ہے۔ اس بنا پر زندگی بسر کرنے کے جو ضابطے وہ اختیار کرتا ہے وہ دنیاوی کامرانیوں اور سربلندیوں کے نقطۂ نظر سے طے نہیں پاتے بلکہ خالق کی خوشنودی کی اساس پر مرتب کیے جاتے ہیں۔ وہ مادی فائدوں اور وقتی مصلحتوں سے یکسر بلند و بالا ہوتے ہیں اور ان کی رفیع الشان عمارت صرف اخلاق کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

"عقبیٰ" اور "آخرت" کے نقطۂ نظر میں اس اختلاف کی وجہ سے دونوں کے جزا اور سزا کے تصورات بھی ایک دوسرے سے یکسر الگ اور جداگانہ ہیں۔ ایک دنیا پرست کے نزدیک چونکہ زندگی اسی زمان و مکان کے اندر مقید ہے اس لیے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُسے اپنے اعمال کا صلہ بھی صرف اسی دنیا میں ملے گا۔ اگر وہ کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اپنی زندگی مادی اعتبار سے بہتر اور آرام دہ بن جائے۔ اور پھر اس سے آنے والی نسلوں کو خوشحالی نصیب ہو اور اگر وہ کسی بُرے کام کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی دنیوی فوائد و لذائذ سے محروم ہو اور مرنے وقت فاقہ مستی کا یہ طوق آنے والے لوگوں کے گلے میں ڈال کر یہاں سے رخصت ہو جائے۔ اُس شخص کی جنت عظیم الشان کوٹھیاں، سرسبز و شاداب کھیتیاں، پھلدار درخت، زیادہ سے زیادہ مال پیدا کرنے والے بڑے بڑے کارخانے اور برق رفتار سواریاں ہیں۔ اور ان چیزوں سے محرومی اس کی نظر میں دوزخ ہے۔

اس کے برعکس ایک مسلمان اس دنیا اور اس کے محدود وسائل و اسباب کو مکافاتِ عمل کے لیے بالکل ناکافی خیال کرتا ہے اور اس بات پر محکم یقین رکھتا ہے کہ آب و گل کی اس دنیا کے

خاتمہ پر ایک حشر برپا ہوگا جس میں حق تعالیٰ بے حجاب ہو کر انسانوں کے سامنے آئیں گے اور ان کے اعمال کا فیصلہ کریں گے۔ وہ لوگ جنھوں نے خدا کے دیئے ہوئے آئین وضوابط کے مطابق زندگی بسر کی ہوگی انھیں فلاح وکامرانی کا تاج پہنا کر جنت میں داخل کیا جائے گا اور راہ حق سے انحراف کرنے والے نامراد ہو کر آتشِ دوزخ میں جھونک دیئے جائیں گے۔ جنت کی آسائش اور دوزخ کا عذاب اگرچہ دنیا کی اس آزمائش گاہ میں کامیابی اور ناکامی کے فطری نتائج ہیں لیکن اُن کا اس عالم رنگ وبُو سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک بالکل الگ کائنات ہے جو محسوسات اور زمان ومکاں کے اُن بندھنوں سے یکسر آزاد ہے جن میں کہ ہم اس عارضی زندگی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہاں کامیابی اور ناکامی کا معیار بھی اس دنیا کے معیارات سے بالکل مختلف ہوگا۔ یہ عین ممکن ہے کہ یہاں ایک شخص دنیوی اعتبار سے نہایت کامیاب ہو۔ وہ اپنے لیے، اپنی قوم کے لیے یا ابنائے جنس کے لیے مادی سربلندی کا پورا پورا اسامان فراہم کرے اور اس لحاظ سے اس کا انجام بھی "بخیر" ہو، لیکن خدا کے حضور میں اُس کے حصے بجز ذلت اور رسوائی کے اور کوئی چیز نہ آنے پائے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایک شخص پوری زندگی معاشی بدحالی اور فاقہ مستی میں بسر کرے، شریر لوگ اُسے تپتی ہوئی ریت پر لٹائیں، وقت کے جبار اور قہار اُس کے جسم کو دہکتے ہوئے انگاروں سے داغیں، اُسے ہر طرف سے رسوا اور ذلیل کرنے کی ناپاک کوششیں کی جائیں اور وہ اسی کس مپرسی اور مظلومیت کی حالت میں اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے، پھر آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہ کوئی مادی چیز ترکہ میں نہ چھوڑے مگر ان سب ناکامیوں کے باوجود وہ خدا کے ہاں فائز المرام ہو۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں آخرت کا وہ تصور جو ایک مسلمان کے نزدیک خدا کی رضا جوئی کے بعد عمل کا سب سے بڑا محرک ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جنت کا حصول یا اس سے محرومی دراصل پروردگار عالم کی خوشنودی یا ناراضگی کا ہی عملی اظہار ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔

کسی نظامِ حیات میں محسوسات کے اس عالم سے ماوراء ثواب و عذاب کا یہ عقیدہ انسان کو حیوانی سطح سے اٹھا کر اُسے اشرف المخلوقات کے بلند درجہ پر لے جاتا ہے اور انسانیت کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ دنیاوی نفع و نقصان یا دوسرے لفظوں میں "مادی سود و زیاں" کو اپنے عمل کا مدار بنانے کی بجائے اخلاق کو اپنے اقوال و افعال کی اساس بنائے انسان کو جانور پر جو امتیاز حاصل ہے وہ صرف یہ ہے کہ جانور یہ کام جبلتوں کی تحریک پر کرتا ہے اور انسان اپنے رویّہ اور طرزِ عمل میں اخلاقی اصولوں کا پابند ہوتا ہے۔

پھر آخرت کا یہ تصور جو اسلام پیش کرتا ہے اس حقیقت کا آئینہ دار بھی ہے کہ اس دین کو پیش کرنے والی کوئی ایسی ازلی و ابدی ذات ہے جو ہر قسم کی دنیوی غرض یا مادی مصلحت سے بالکل بے پرواہ ہے اور اُس نے اس کی تشکیل خالص اخلاق کی بنیادوں پر کی ہے۔ اس میں بلاشبہ مادی فلاح و بہبود کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے مگر اس چیز کو اس کا مبداء یا اساس نہیں ٹھہرایا گیا۔ اس میں اشیاء و اعمال کے وزن کرنے اور اُن کی تقویم کے لیے دوسری میزان اور دوسرا مقوّم ہے اور وہ اُن کا دینی یا اخلاقی نفع یا اُخروی اجر ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت میں جو ایک گہرا تعلق اور رابطہ موجود ہے۔ تاریخ کے پورے صفحات اُس کے شاہد ہیں۔ دنیا کی جن جن قوموں میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے اُن میں آخرت کا عقیدہ بھی کسی نہ کسی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ خدا کا تصور جتنا صحیح اور نکھرا ہوا ہوگا اتنا ہی اُن کا عقیدۂ آخرت بھی درست اور واضح ہوگا اور جتنا جتنا خدا پر ایمان کمزور ہوگا اُسی تناسب سے آخرت پر یقین بھی مضمحل ہوتا چلا جائے گا۔ ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم ان دونوں کے باہمی تعلق کا پوری طرح جائزہ لیں۔ یہاں ہم صرف اس امر سے بحث کریں گے کہ تہذیبِ جدید نے خدا کے معاملے میں جو گمراہیاں پھیلائی ہیں انہوں نے عقیدۂ آخرت کو کس طرح متاثر کیا ہے۔

مذہب اور اس کے مسائل سے معمولی دلچسپی رکھنے والا آدمی بھی اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ مذہب کے دائرہ میں اصل اور فیصلہ کن چیز یہ نہیں کہ ہم کسی بلند و بالا ہستی کے وجود کو مانتے ہیں یا نہیں بلکہ اس ضمن میں اساسی اور بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں یا نہیں کہ جس خالق نے ہمیں وجود بخشا ہے، ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں دی ہیں، اُس نے ہمیں زندگی گزارنے کا کوئی ایسا ضابطہ بھی دیا ہے یا نہیں جو ہمیں اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کے دامِ تزویر سے محفوظ رکھے اور ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم اپنے دامن کو اس کے کانٹوں میں الجھائے بغیر اس کی سرحد کو عبور کر جائیں۔ مذہب اور الحاد کے درمیان اصل بنائے نزاع یہی ضابطۂ حیات ہے اور یہی وہ اصل وجہ ہے جس کی بنا پر ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسالت کو بھی نجات کے لیے ایک ضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔ جو شخص رسالت کو نہیں مانتا وہ درحقیقت خدا کا اور اُس کے دیئے ہوئے آئین و ضوابط کا انکار کرتا ہے وہ بے شک کھلا ہوا منکرِ خدا نہ ہو مگر اس بات کا ضرور قائل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی علاقہ یا تعلق نہیں۔

خدا کے وجود کا مجرد اقرار ممکن ہے کبھی کبھی زندگی کے مصائب و شدائد برداشت کرتے ہوئے ہمیں کچھ سہارا دے دے لیکن اس قسم کے کمزور اور "جزوی ایمان" سے ضلالتوں اور گمراہیوں کی وہ تاریکیاں کافور نہیں ہو سکتیں جو شیطان اور اُس کی ذریت نے اس دنیا میں پھیلا رکھی ہیں۔ اُن کو دُور رکھنے کے لیے تو ایک ایسے خدا پر ایمان لانے کی ضرورت ہے جس کی فرماں روائی انسانی زندگی کے سارے گوشوں پر محیط ہو اور جو ہر قدم پر انسان کی دستگیری اور رہنمائی کرے۔

جو فرد یا قوم جس حد تک مالک الملک کو دنیاوی معاملات سے بے دخل کرے گی اُسی حد تک اُس کی "آخرت" اسی مادی دنیا تک محدود ہو گی۔ جب ایک شخص اس کارگہِ حیات میں اس غلط تصور کے ساتھ شریک ہوتا ہے کہ خدا کا تعلق زندگی کے صرف ایک گوشے سے ہے تو وہ لامحالہ حیاتِ انسانی کے بیشتر شعبوں کے لیے خود اپنے آئین و ضوابط وضع کرے گا۔ ظاہر بات ہے

کہ ان اصولوں کی تشکیل و تدوین صرف دنیوی نفع و نقصان کی بنیاد پر ہی کی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے حق وہ قرار پائے گا جس سے کسی فرد یا قوم کو دنیاوی فوائد و لذائذ حاصل ہوں اور ہر وہ چیز باطل ٹھہرائی جائے گی جس سے ان میں کمی واقع ہو۔ اس حال میں خواہ خدائی خالقِ کائنات ہی کی تسلیم کی جائے مگر عملی فرمانروائی کا منصب مادیت کو حاصل ہوگا اور اسی کے دیئے ہوئے ضابطوں کے مطابق اس مادی دنیا میں افراد یا اقوام اپنے کیے کی جزا اور سزا پانے کی خواہشمند ہونگی۔

"دنیوی آخرت" کا یہ غلط تصور دراصل دین و دنیا کی دوئی کا فطری نتیجہ ہے۔ جب زندگی کے معتدبہ حصہ پر مادیت کی حکمرانی تسلیم کر لی جائے تو پھر ہمیں لازمی طور پر یہ بات بھی ماننی پڑیگی کہ آب و گل کی یہی دنیا ہماری "آخرت" بھی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب ایک انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ اُس کے مالک نے اُسے پوری زندگی کے لیے کوئی ضابطہ نہیں دیا تو وہ لازمی طور پر دنیاوی سود و زیاں کے نقطۂ نظر سے اس دنیا میں عمل کرتا ہے اور پھر اسی کے مطابق مادہ کی اس محدود دنیا میں اپنی سعی و جہد کے نتائج و ثمرات دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ ایسی آخرت کو تسلیم نہیں کرتا جو مادی دنیا سے ماورا ہو۔

بالکل اسی طرح وہ شخص جو اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ اُس کے خدا نے اُس کی تخلیق کر کے اُسے بالکل آزاد نہیں چھوڑ دیا بلکہ زندگی بسر کرنے کا ایک ایسا اخلاقی ضابطہ بھی دیا ہے جو مادی نفع و نقصان سے بالکل ماورا ہے۔ ایسا شخص کس طرح یہ باور کر سکتا ہے کہ مادی دنیا کی یہ جولانگاہ اُس کی "آخرت" بھی بن سکتی ہے اور یہ حقیر سے دنیاوی فوائد اُس کے اخلاقی اعمال کے ثمرات بھی ہو سکتے ہیں

پھر اسی سلسلہ میں ایک اور پہلو بھی نہایت قابلِ غور ہے۔ جب ایک انسان یہ کہتا ہے کہ اُس کی آخرت صرف اسی مادی دنیا میں ہوگی اور زندگی کی سرحد کے اِسی طرف اُسے اپنے اعمال کی

جزا اور سزا دی جائے گی تو وہ خود اپنے بارے میں اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ اس کی حیثیت اس کارخانۂ حیات میں ایک عارضی اور اتفاقی شے کی سی ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی نہ صرف تخلیق ہے بلکہ اُن کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا بھی ہے۔ کوئی انسان خواہ اسے مانے یا اس سے انکار کرے مگر یہ چیز اس "دنیوی آخرت" کے تصوّر کا بالکل منطقی نتیجہ ہے۔ جب نیکی محض دنیوی فائدہ کی ہم معنی ہو اور بدی محض زر و مال کے خسران کا دوسرا نام سمجھ لیا جائے اور اعمال صالح وہ قرار پائیں جن سے اہلِ قوم یا وطن کو مادی اعتبار سے فائدہ پہنچے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی اپنی الگ کوئی حیثیت نہیں بلکہ وہ اجتماعیت کے عظیم کارخانے میں ایک بے جان پرزہ ہے۔ اس کے سارے افکار و اعمال، اس کی ساری خواہشات و تمنائیں چاہے وہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں صرف مادیت کی کرشمہ سازی ہیں۔ وہ اپنی حماقت سے بیشک اپنے آپ کو کائنات کا مرکز تصوّر کرتا رہے مگر یہ اس کی ابلہ فریبی ہے۔ اجتماعیت کے اس بحرِ بیکراں میں اس کی اصل حیثیت وہی ہے جو سمندر میں ایک قطرہ کی، یا انسانوں کے ریوڑ میں ایک حیوانِ ناطق کی ہے حیاتِ انسانی کا یہ تصوّر نہ صرف انسان کے اندر روح کے وجود کی نفی کرتا ہے بلکہ وہ انسان کو جوہرِ انسانیت سے بھی محروم کر کے اُس کی انفرادیت اور خودی کا گلا گھونٹتا ہے۔ اس نظریہ کا مقصد یہ ہے کہ فرد اجتماعیت کے مادی مفاد کی خاطر اپنی ہر چیز، خواہ وہ زر و مال ہو یا دین و ایمان، قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ جرمنی کے وزیرِ داخلہ نے غالباً اسی خیال کی ترجمانی کی تھی جب اُس نے واشگاف الفاظ میں کہا:

> "قوم کا مفاد ہی درحقیقت حق کا سب سے بڑا معیار ہے۔ حق وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نفع حاصل ہو اور باطل وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نقصان پہنچے۔ ہٹلر کی خدمت جرمنی کی خدمت ہے اور جرمنی کی خدمت خدا کی خدمت ہے"

چنانچہ دیکھیے کہ دنیا کی جن قوموں نے آخرت کا انکار کیا ہے یا جنھوں نے اس دنیا کو "ہی آخرت" سمجھا ہے وہ آہستہ آہستہ اس بات پر مجبور ہو گئی ہیں کہ افراد کو اجتماعیت میں اس

طرح گم کر دیں کہ ان کا کوئی الگ وجود باقی نہ رہے۔ اِس طرزِ فکر نے انسانیت کی جس طرح سے مٹی پلید کی ہے وہ ایک نہایت لمبی داستان ہے۔ یہاں ہم اُس کے صرف چند اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اس کا پہلا اثر جو انسانیت نے قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی مادی ترقی ہی انسانی زندگی کا منتہائے مقصود قرار پائی ہے۔ اور اس وجہ سے انسانیت کے مختلف گروہ اور طبقے مادی اسباب کی فراہمی کے لیے ہر قسم کے اخلاقی ضوابط کو نظر انداز کرتے ہوئے دیوانہ وار جدوجہد کر رہے ہیں۔ دنیاوی مال و متاع کو سمیٹنے کی اس مجنونانہ ہوس نے نہ صرف ایک انسان کو دوسرے سے ٹکرا دیا ہے بلکہ اُس کے اندر مستقل خوف و ہراس کی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے جس سے خود غرضی، سنگدلی، بخل، تنگ نظری، بد عہدی، اور خیانت جیسے ذلیل خصائص بڑی سرعت کے ساتھ ابھر رہے ہیں۔

دوسرے اس طرزِ خیال سے انسانیت کا مستقبل بھی سراسر تاریک ہو گیا ہے۔ جو فلسفہ انسانی خودی کے عملِ تخلیق کو مادہ کی محدود دنیا میں مقید کرتا ہے وہ ممکن ہے اس کرۂ ارضی پر صنعتی اور زراعتی انقلاب لے آئے مگر زندگی کی شبِ تاریک کو کبھی بھی سحر میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ احساس و وجدان یا قلب و روح ہی درحقیقت وہ قوتیں ہیں جن کے ذریعہ انسان زمان و مکان کے جابرانہ تسلط سے نجات حاصل کر کے ایک بہتر اور شادکام زندگی کا تصور کرتا ہے جسے وہ مذہب کی اصطلاح میں آخرت کہتا ہے۔ اور اگر اس سے یہ قوتیں سلب کر لی جائیں تو پھر اُس کی زندگی کی ساری شمعیں خود بخود گل ہو جاتی ہیں۔ اس نظریۂ حیات کی مضرتوں پر بحث کرتے ہوئے فلسفۂ تاریخ کا مشہور مفکر رقمطراز ہے:

"جب ہم یہ اصول تسلیم کرتے ہیں کہ ایک فرد سماج کے لیے ہی زندہ ہے تو اس سے انسانی زندگی کا کعبۂ مقصود ہی بدل جاتا ہے۔ اب انسانی زندگی میں سب سے

اہم چیز افراد کی روحانی نشو ونما نہیں رہتی بلکہ قوموں کے سطوت وجبروت میں اضافہ قرار پاتا ہے۔ اگر اسے صحیح مان کر ہم اس کے مطابق عمل کرنا شروع کریں تو دنیا میں اس سے سنگین قسم کی بداخلاقی جنم لیگی۔ یہ نظریہ کہ فرد محض سماج کا ایک بے جان حصہ ہے کیڑوں مکوڑوں کے متعلق تو درست ہو سکتا ہے مگر اس کا اطلاق انسانوں پر کبھی نہیں ہو سکتا۔ جب ہم ایک فرد کو محض ایک قوم کا جزو سمجھتے ہیں تو اس سے خدا اور بندے کے تعلقات کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے اور خدا پرستی کی جگہ قوم پرستی لے لیتی ہے"

انسان کی انسانیت یا دوسرے لفظوں میں اس کی "انفرادی انا" جو اخلاق و اقدار کا منبع ہے اور جس کی وجہ سے ملائکہ نے بھی اُس کی برتری کو تسلیم کیا، صرف اُسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے جب ایک انسان کے دل میں یہ خیال راسخ ہو کہ مادی دنیا کے اس ہنگامہ کے خاموش ہو جانے پر ایک حشر برپا ہوگا جس میں دنیا کے سب لوگ اپنے اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ خدا کے حضور میں پیش ہوں گے اور انہیں اُن کی کارگزاریوں کی انفرادی طور پر جزا اور سزا دی جائے گی۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو بے شمار مقامات پر واضح فرمایا ہے۔ ہم یہاں صرف چند آیات نقل کرتے ہیں:

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ (۲۳-۶)

پھر جب صور پھونکا جائیگا تو اس روز ان میں کوئی نسبی تعلق باقی نہ رہیگا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے جن کے اعمال کا پلہ بھاری ہوگا وہی لوگ فلاح پائیں گے اور جن کے اعمال ہلکے ہوں گے وہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے خود اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ

وہ دن جب کہ ہر نفس ہر اس نیکی کو جو اس نے کی ہے

خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ (۳:۳۰)
وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ
فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ
كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔
مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ
وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ
وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۱۷:۷)

اور اس برائی کو جو وہ کر چکا ہے حاضر پائیگا۔
ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائیگا۔ پڑھ اپنا نامۂ اعمال آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔ جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے لیے ہی مفید ہے اور جو گمراہ ہوا اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

یہ تصور کہ انسان منفرداً اللہ کا خلیفہ ہے اور اسی لحاظ سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے اور اللہ کی عدالت میں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں پیش ہو گا۔ انسانی روح یا خلاقی انا کی موجودگی کی ایک محکم دلیل ہے۔ اور اگر یہ تصور ختم ہو جائے تو انسان پھر انسانیت کی بلند سطح سے گر کر چوپاؤں کی سطح پر آجاتا ہے جسے اجتماعیت کی قوت بے زبان گلہ کی طرح جس طرح چاہتی ہے بالکل میکانکی طور پر ہانک کر لے جاتی ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ توحید، رسالت اور آخرت کے تصورات کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خدا کی ہستی کا اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر رسالت اور خدا کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اور اس ضابطۂ حیات پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اسی سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کریں اور مادی سود و زیاں سے یکسر بلند ہو کر اس کی پابندی کو اپنا منتہائے

مقصود سمجھیں۔ اس اخلاقی ضابطہ کی پابندی کے نتائج ممکن ہے کچھ مادی دنیا میں بھی ظاہر ہوں مگر مادہ کی یہ محدود دنیا اُن کے پوری طرح بار آور ہونے کے لیے موزوں نہیں۔ یہاں اعمال کو ناپنے کے لیے جو پیمانے موجود ہیں ان سے چونکہ مادی اشیا کی ہی پیمائش کی جاسکتی ہے اس لیے انسانی فطرت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اُس کے وہ اعمال جن کا محرک صرف خدا کی رضا جوئی ہو، اس کو تولنے کے لیے بھی کوئی میزانِ عدل قائم کی جائے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ میزان اس مادی دنیا میں تو نصب نہیں کی جاسکتی اس کا قیام تو وہیں ہوسکتا ہے جہاں مادیت کی کوئی عملداری نہ ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے توحید رسالت اور آخرت کو ساتھ ساتھ رکھا ہے اور ان تینوں کو ایمان کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس بات کا تو دعویٰ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ تینوں ایک ہیں مگر یہ چیز وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ تینوں ایک ہی زنجیر کے مختلف حلقے ہیں اور ان کے مابین ایک گہرا ربط او تعلق موجود ہے اور اگر کسی ایک کے اندر کوئی معمولی سی تبدیلی کی جائے تو دوسرا خود بخود متاثر ہوجاتا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے ہم صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

اہلِ مغرب نے جس روز دین و دنیا کی دوئی کے فلسفہ کو قبول کیا اُسی دن سے خالقِ کائنات ایک سوچی سمجھی پلان کے تحت دنیا کے معاملات سے بے تعلق کر دیئے گئے۔ پھر خداوند تعالیٰ کا دخل جس طریق سے انسان کی روزمرہ زندگی کے ساتھ کم ہوتا گیا بالکل اسی انداز سے آخرت کے عقیدہ پر بھی مُردنی چھاگئی۔ دین و دنیا کی اس تفریق کا پہلا اثر یہ رونما ہوا کہ انسان نے خالق کے وجود کے محض اقرار کو نجات کے لیے کافی سمجھ لیا اور اس کے دیئے ہوئے ضابطہ کو یکسر نظرانداز کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اخلاقی اصولوں کو اپنا رہنما بنانے کی بجائے مادی مصلحتوں کو اپنے اعمال کا محرک ٹھہرایا۔ جھوٹ اگر دنیا میں نقصان کا موجب ہوا تو وہ گناہ تھا اور اگر فائدہ کا ذریعہ ثابت ہوا تو وہ عین ثواب بن گیا۔ صداقت اگر دنیا میں جلبِ منفعت کی بنیاد بنی تو وہ نیکی قرار پائی ورنہ سب سے بڑی برائی سمجھی جانے لگی۔ الغرض اس دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا بُرے نتیجے کے مرتب

ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ اور انسان نے صرف انہی افعال و اعمال کو اہمیت دینا شروع کی جن کے نتائج اس دنیا میں نظر آسکتے ہوں یا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ انسان کی مادّی زندگی سے جس قدر دُور ہوتا چلا گیا بالکل اسی طرح انسان نے آخرت کو کھینچ تان کر زمان و مکان کی حد بندیوں میں محدود کر دیا۔ جس سوسائٹی میں حق و باطل میں تفریق خداوند تعالیٰ کی کتاب اور اُس کے پیغمبر کی تعلیمات کی بجائے مادی نفع و نقصان کی بنیاد پر کی جائے اس میں اگر "دنیوی آخرت" کا غلط تصور ترقی پا جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔

اہلِ مغرب کے علاوہ خود مسلمانوں کے ہاں اس نظریاتی تغیر و تبدل کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے وہ خیر خواہ جن کی نظروں کو یورپ کی مادی ترقی نے خیرہ کر رکھا ہے اس امت کی فلاح اسی میں دیکھتے ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کو مذہب کے اثر سے آزاد کر دیا جائے۔ ان سب حضرات نے اس مقصد کے حصول کے لیے جو تدابیر اختیار کی ہیں اُن کی نوعیت قریب قریب ایک جیسی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے سنت کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کیے جاتے ہیں تاکہ قرآنِ حکیم میں من مانی تاویلات کا دروازہ کھل سکے۔ پھر بڑی حکمت و دانائی سے عصری تقاضوں اور وقتی مصلحتوں کا تذکرہ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں فرض کے مقابلے میں مصلحت کی اہمیت ابھرنے لگتی ہے۔ اس کے بعد خیر و شر کے پیمانے اور جزا و سزا کے تصورات تبدیل کرنے کے لیے کچھ اصول گھڑ لیے جاتے ہیں۔ آپ سرسید مرحوم اور اُن کے ہم خیال لوگوں کی تحریروں کا ایک سرسری جائزہ لیں تو اُن میں یہ طرزِ فکر پورے طور پر کارفرما نظر آئے گا۔

اسی قسم کی ایک منظم کوشش اب حال میں متجددین کا ایک نیا گروہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے پیشروؤں کی طرح مغربی افکار و نظریات سے مرعوب ہی نہیں بلکہ مغلوب و مفتوح بھی ہیں۔ اور امت کی بہتری اسی میں سمجھتے ہیں کہ اس کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو "دنیوی سود و زیاں" کی

بنیاد پر استوار کیا جائے۔ کیونکہ ان کے نزدیک مادی ترقی کے حصول کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ملّت کو اسلام کے دیئے ہوئے ضابطوں سے نجات دلا کر اُسے دنیوی مصلحتوں کا غلام بنا دیا جائے۔ اس کے لیے عملی طریقے صرف دو ہی ہیں ایک تو یہ کہ دین کا اس قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق باقی نہ رہنے اور بالفرض اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر تعلیماتِ الٰہی میں لچک پیدا کرنے کا کوئی ایسا اصول وضع کر لیا جائے جس کی مدد سے اس دین کو وقتی مصلحتوں کے سانچوں میں بڑی آسانی کے ساتھ ڈھالا جا سکے۔

اس قوم کا اپنے دین کے ساتھ جو ایک گہرا تعلق ــــ چاہے اس کی بنیاد جذبات ہی سہی ــــ صدیوں سے رہا ہے اُس کے پیشِ نظر یہ بات تو ممکن نہیں کہ اُسے کھل کر یہ کہا جا سکے کہ تم دین کو خیر باد کہہ دو۔ اس لیے چار و ناچار قوم کے ان "غمگساروں" کو اسے معراجِ ترقی پر پہنچانے کے لیے دوسرا راستہ ہی اختیار کرنا پڑا ہے۔

دین کے اندر لچک پیدا کرنے اور اُسے عصری اور وقتی مصلحتوں کے تقیدات کا پابند بنانے میں جو چیزیں سب سے زیادہ مانع ہیں اُن میں ایک تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے اور دوسرا عقیدۂ آخرت۔ حضورؐ کی سنّت کے اقرار کے یہ معنی ہیں کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ حضورؐ نے پیغامِ الٰہی کو جس صورت میں زمان و مکان کے اندر محفوظ کر کے اسے ایک پیکرِ محسوس عطا فرمایا ہے وہ ہمارے لیے ایک آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے اور اس اعتبار سے ہر دَور میں لائقِ اتباع ہے۔ قرآن کی ہر وہ تعبیر جو اس صورت سے الگ کوئی دوسرا نقشہ مرتب کرتی ہو وہ بالکل غلط ہے ــ یہ عقیدہ قرآن مجید کی من مانی تاویلات کی راہ میں سب سے زیادہ مزاحم ہے۔ اس مزاحمت کو یہ کہکر دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اور کیا وہ وقت کا ایک تقاضا اور مطالبہ تھا اُسے ایک مستقل شکل دینا خدا کے منشا کے منافی ہے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد اب قرآن مجید کی تشریح و تعبیر کا حق صرف "مرکزِ ملّت" کو پہنچتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں حضورؐ کی زندگی میں جو مقام دین کے اندر خود حضورؐ کو حاصل تھا وہ اب "مرکزِ ملّت" کو حاصل ہے اور یہ ادارہ اس

بات کا مجاز ہے کہ وہ وقتی مصلحتوں اور عصری تقاضوں کے تحت دین کے اندر مناسب تبدیلیاں کرتا ہے۔ اس نظریہ نے نہ صرف اسلام کے ازلی و ابدی احکام کو وقتی مصلحتوں کے تابع کر دیا ہے بلکہ اس سے رسالت کے بلند مقام کو بھی شدید صدمہ پہنچا ہے اور دین میں ہر فتنے کو گھسنے کا پورا پورا موقع مل گیا ہے۔ یہ وقتی یا عصری مطالبات جن کو اس قدر اہمیت دی جا رہی ہے دنیوی اغراض یا مادی مصالح ہی ہیں۔

اس راہ کا دوسرا سنگِ گراں "عقیدۂ آخرت" ہے۔ مسلمانوں کا یہ نظریہ کہ انسان کو اپنے اعمال کی جزا و سزا اس دارِ فانی میں نہیں بلکہ اس کے فنا ہونے پر ایک حیاتِ ابدی میں ملے گی، اُن کی اخلاقی انا کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ یہ اعتقاد ہی انہیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ دنیوی نفع و نقصان سے یکسر بے پروا ہو کر اس دنیا میں حق و صداقت کے گواہ بنیں۔

مسلمانوں کے اس اخلاقی طرزِ عمل کو ایک مصلحت پرستانہ طرزِ عمل میں تبدیل کرنے کے لیے اُن کے ذہن میں بڑی چابکدستی کے ساتھ یہ نظریہ راسخ کیا جا رہا ہے کہ جزا و سزا اور آخرت کے وہ تصورات جو تمہارے ہاں صدیوں سے موجود ہیں وہ سب اعتباری باتیں ہیں، یہ سب جاہل اور کم علم ملاؤں کی اختراعات ہیں۔ ان تصورات کو فروغ دینے اور پھیلانے میں ان "فریب کاروں" کی غرض یہ ہے کہ تمہیں وعدۂ فردا کے ذریعہ اس دنیا سے غافل کر دیا جائے اور وہ خود ہر قسم کے مزے لوٹتے رہیں۔ اگر جنت و دوزخ کوئی چیز ہے تو اسی دنیا میں موجود ہے۔ اس بنیادی تبدیلی کے بعد نیکی اور بدی یا خیر و شر کے معیار بھی یکسر بدل گئے ہیں۔ اب "عمل صالح" وہ عمل قرار پایا ہے جس کے نتائج اس عالم رنگ و بو میں دیر کے بعد رونما ہوں۔ یہ ہے وہ طریق جس سے دین کے اُن سادہ سے معتقدات کو جو درحقیقت دین کی جان ہیں اور ایک مسلمان کے اندر اخلاقی احساس و شعور کو بیدار کرتے ہیں، ایک لگے بندھے منصوبہ کے تحت مٹایا جا رہا ہے تاکہ ان کی جگہ مادی محرکات کو بڑی آسانی کے ساتھ اس امت کی رہنما قوت بنا دیا جائے۔